ISSN 2249-894X Impact Factor : 3.8014 (UIF) Volume - 6 | Issue - 2 | November - 2016

Review Of Research

'غبارِ خاطر' اور مولانا ابوالکلام آزاد کے فلسفیانہ افکار

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کی ایک بڑی دیدہ ور شخصیت تھے۔ وہ بے مثل انشاپرداز، ماہر زبان داں، نادر مرقع نگار، مایہ ناز مفکر، ممتاز فلسفی اور صحافت کی قلمرو کے مطلق العنان حکمران، عدیم المثال مبدع، منفرد سیاست، نادر مفسر قرآن اور فنون لطیفہ پر دست رس رکھنے والے کونا گوں اوصاف کی حامل شخصیت تھے۔ ادبی شاہ کار "غبارِ خاطر" کے خطوط مولانا آزاد کے مندرجہ بالا اوصاف کا شفاف آئینہ ہیں۔ ان خطوط میں جس موضوع پر بھی انہوں نے خامہ فرسائی کی ہے اس پر انتہائی تسلی بخش انداز میں روشنی ڈالی ہے روزمارہ کی معمولی باتیں، جن کی طرف ہم کبھی توجہ نہیں دیتے۔ ان پر اس طرح فلسفیانہ انداز میں اظہار کیا ہے۔ کہ قاری انگشت بہ دندان رہ جاتا ہے۔ مولانا آزاد کا دماغ مخزن ذہانت سے معمور تھا۔ وہ علم وفن کا ایک ایسا تراشیدہ ہیرا ہیں۔ جس کا ہر پہلو روشن اور تابناک تھا۔ یوں تو آزاد کی تمام تحریریں ان کی فلسفیانہ خیالات کے موتیوں سے آراستہ ہیں لیکن "غبارِ خاطر" میں ان موتیوں کی افراط دکھائی دیتی ہے۔

زندگی کی حقیقت سے ناواقفیت اور اپنی کم فہمی کی بدولت بعض اوقات انسان کی زندگی میں آسودگیاں کم اور اضطراب و ناکواریاں زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ حالات سے مایوس ہوکر انسان زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن چوں کہ دنیا کی ہر شے کی طرح قضاقدر کا اختیار بھی خالق کائنات کو ہے۔ اس لئے نہ چاہتے ہوئے بھی انسان کو دُنیا میں رہنا ہوگا۔ اور اس ناقابل برداشت بوجھ یعنی زندگی کو اٹھانا پڑے گا۔ اس موضوع پر خط نمبر ۶ میں آزاد کا فلسفیانہ خیال ملاحظہ ہو:

> "خود زندگی بھی مرتا رسر ایک بوجھ ہے خوشی سے اٹھائیں یا ناخوشی سے مگر جب تک بوجھ پڑا ہے اٹھانا ہی پڑتا ہے۔"

زندگی میں جب آلام ومصائب کی کالی گھٹائیں چھا جاتی ہیں تو ہم بے حد گھبرا جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان ناگفتہ بہ حالات سے جلد از جلد چھٹکارا پالیں لیکن جب مصائب کے بادل چھٹ جاتے ہیں تو ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا چشم زدن میں رنج وغم کا یہ زمانہ گذر گیا (خط نمبر 3 صفحہ 8) یہ ذکر ملاحظہ ہو:

> "غور کیجئے تو انسان کی زندگی اور اس کے احساسات کا بھی ایک عجیب حال ہے۔ تین برس کی مدت ہو یا دن کی مگر جب گذرنے پر آجاتی ہے تو گذر ہی جاتی ہے۔ گذرنے سے پہلے سوچئے تو حیرانی ہوتی ہے کہ یہ پہاڑ سی مدت کیوں کر کٹے گی۔ گذرنے کے بعد سوچئے تو تعجب ہوتا ہے کہ جو کچھ گذر چکا وہ چند لمحوں سے زیادہ نہ تھا۔"

ہماری روزمرہ کی زندگی میں ہم مختلف پھاٹکوں کو کئی مرتبہ کھلتے اور بند ہوتے دیکھتے ہیں۔ چوں کہ یہ ہماری زندگی کے معمولات میں شامل ہے۔ اس لئے اس طرف ہم کبھی توجہ نہیں دیتے۔ لیکن ۱۹ اگست ۱۹۴۲ء کو انگریز حکومت نے جب مولانا آزاد کو گرفتار کیا اور احمد نگر کے قلعہ سال قلعہ میں انہیں محبوس کرنے کا فیصلہ کیا تو قلعہ احمد نگر میں ان کے داخل ہونے کے بعد جب

قلعہ کا پھاٹک بند کیا جانے لگا تو پھاٹک کو بند ہوتے دیکھ کر مولانا آزاد نے فلسفیانہ انداز میں اس طرح اظہار کیا۔ (خط نمبر 5 صفحہ نمبر 19) میں یہ ذکر ملاحظہ ہو:

> "اس کارخانہ ہزار شیوہ و رنگ میں کتنے ہی دروازے کھولے جاتے ہیں تاکہ بند ہوں اور کتنے ہی بند کیے جاتے ہیں تاکہ کھلیں"۔

احمد نگر ریلوے اسٹیشن سے قلعہ احمد نگر تک جانے کا راستہ بالکل سیدھا ہے۔ راستے میں کہیں بھی کوئی موڑ نہیں ہے اس صراط مستقیم کو دیکھ کر آزاد کے ذہن میں یہ فلسفیانہ خیال آیا تھا۔ (خط نمبر 5 صفحہ نمبر 27) میں یہ ذکر ملاحظہ ہو:

> اسٹیشن سے قلعہ تک سیدھی سڑک چلی گئی ہے راہ میں کہیں کوئی موڑ نہیں ملی۔ میں سوچنے لگا کہ مقاصد کے سفر کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ جب قدم اٹھایا تو پھر کوئی موڑ نہیں ملتی۔ اگر مڑنا چاہیں تو صرف پیچھے کی طرف مڑ سکتے ہیں لیکن پیچھے مڑنے کی راہ یہاں پہلے ہی بند ہو جاتی ہے۔"

فلسفہ سائنس اور مذہب ان تینوں کا اگر ہم جائزہ لیں تو حقیقت ہم پر منکشف ہو جاتی ہے۔ کہ اس عالم فانی میں زندگی گذارنے کے لیے فلسفے کی گتھیوں کو سلجھانے اور سائنس کی ثابت شدہ حقیقتوں کو جاننے کی ضرورت نہیں بلکہ مذہب کو صحیح معنوں میں جاننے کی ضرورت ہے کیوں کہ فلسفہ عملی زندگی کی تلخیوں کو مٹھاس میں تبدیل کرنے کے سلسلے میں ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ فلسفہ عارضی سکون تو ضرور دیتا ہے۔ لیکن دائمی نہیں۔ ہماری زندگی میں جو کمیاں ہیں اس کا افسوس تو کم کراتا ہے۔ لیکن یہ کمیاں دوسرے طریقے سے کس طرح پوری ہو سکتی ہیں۔ اس کی امید نہیں دلاتا۔ زندگی میں ہم کچھ کھو کر کچھ پاتے ہیں۔ اس سے متعلق وہ کچھ نہیں بتلاتا اور بتلا سکتا ہی نہیں اس لیے زندگی کی تلخیاں گوارا کرنے کے لیے ہمیں اس کا سہارا کافی نہیں ہے۔ سائنس عالم محسوسات کی ثابت شدہ حقیقتوں سے ہمیں آشنا تو کراتا ہے لیکن عقیدے کی تسکین یہ بھی نہیں دیتا اس لیے زندگی کی ناگواریوں کو برداشت کرنے کے لیے اس کا سہارا بھی ناکافی ہے۔ زندگی کے رنج و غم کو مٹانے کے لیے ہم امید و آس کی نظر سے کسی طرف دیکھ سکتے ہیں تو وہ صرف اور صرف مذہب ہے۔ وہی ہماری زندگی کی تاریک راہوں کو منور کر سکتا ہے۔ مذہب ہی وہ سہارا ہے جس سے ہم آسرا لے سکتے ہیں۔ خط نمبر 6 میں اس موضوع پر آزاد کا فلسفیانہ خیال ہے۔

> "فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا اور پھر اسے بند نہیں کر سکے گا۔ سائنس ثبوت دے گا مگر عقیدہ نہیں دے سکے گا۔ لیکن مذہب ہمیں عقیدہ دیتا ہے۔ اگرچہ ثبوت نہیں دیتا اور یہاں زندگی بسر کرنے کے لیے ثابت شدہ حقیقتوں ہی کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ عقیدہ کی بھی ضرورت ہے۔"

نشہ اور سرور صرف مے اور نشیلی اشیاء میں ہی نہیں ہوتا بلکہ ہر وہ چیز انسان پر نشیلی کیفیت طاری کرتی ہے جس سے اسے عشق ہوتا ہے یہ عشق یا نشہ مختلف قسم کی طبیعتوں پر مختلف طریقوں سے ہوتا ہے۔ کسی کو علم حاصل کرنے کا نشہ ہوتا ہے۔ تو کسی کو

موسیقی، مصوری وسنگتراشی وغیرہ کا۔ مولانا آزاد پر صحافت کا نشہ طاری تھا۔ اس سلسلے میں معاشی، ذہنی اور جسمانی طور پر انہیں بہت سی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ نشے کی کیفیت میں کسی بھی تکلیف کا انہیں احساس نہیں ہوا لیکن جب 1916ء میں حکومت نے ان کے اخبار "البلاغ" کو بند کیا اور انہیں رانچی میں نظر بند کیا تو اس وقت ان کی صحافت کا نشہ اکھڑ گیا اور انہیں ان چوٹوں کا احساس ہونے لگا جو دوران صحافت انہیں لگی تھیں۔ نشے سے متعلق خط نمبر 6 میں آزاد کا نظریہ صفحہ نمبر 36 پر ملاحظہ ہو:

"نشہ کی تیزی میں کتنی ہی سخت چوٹ لگے، اس کی تکلیف محسوس نہیں ہوگی۔ تکلیف اس وقت محسوس ہوگی جب نشہ اترنے لگے گا اور جماہیاں آنی شروع ہوں گی۔ اس وقت ایسا معلوم ہوگا جیسے سارا جسم درد سے چور چور ہو رہا ہے"

اس دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہونگے جو لا مذہب ہوں گے عام طور پر مذہب انسان کو ورثے میں ملتا ہے اور انسان اسی کو اپنا مذہب مانتا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بہت ہی غور وخوض کے بعد اپنے لئے کوئی نیا مذہب ڈھونڈتے ہیں یا جس مذہب سے متعلق ہوتے ہیں اس کا غائر طور پر مطالعہ کر کے اس کے اصولوں پر سختی سے کاربند ہو جاتے ہیں۔ ورنہ دنیا میں ایسے افراد کی تعداد زیادہ ہے۔ جو بغیر غور وفکر کے آباواجداد کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ خط نمبر 6 میں آزاد کا فلسفیانہ خیال دیکھئے صفحہ نمبر 40۔

"ایک مذہب موروثی مذہب ہے کہ آباواجداد جو کچھ مانتے آئے ہیں مانتے رہیے۔ ایک جغرافیائی مذہب ہے کہ زمین کے کسی خاص ٹکڑے میں ایک شاہراہ عام بن گئی۔ سب اسی پر چلتے ہیں اور آپ بھی چلتے رہیے۔ ایک مردم شماری کا مذہب ہے کہ مردم شماری کے کاغذات میں ایک خانہ مذہب کا بھی ہوتا ہے۔ ایک رسمی مذہب ہے کہ رسموں اور تقریبوں کا ایک سانچہ ڈھل گیا ہے۔ اسے نہ چھیڑیے اور اسی میں ڈھلتے رہیے۔ ان تمام مذہبوں کے علاوہ بھی ایک اور حقیقت باقی رہ جاتی ہے تعریف وامتیاز کے لیے اسے حقیقی مذہب کے نام سے پکارنا چاہیے اور اسی کی راہ گم ہو جاتی ہے۔"

زندگی راحت والم کے احساس کا ایک حسین امتزاج ہے اور اس امتزاج کے بغیر زندگی مکمل نہیں ہو سکتی۔ یہ احساس مختلف مزاج اور طبیعتوں پر مختلف طرح سے ہوتا ہے اور اس لئے تمام انسانوں کو ہم ایک ترازو میں نہیں تول سکتے مثلاً ایک مصور کو اپنی بنائی تصویر دیکھ کر جو خوشی ہوتی ہے۔ عام آدمی تصویر کی خوبصورتی کی تعریف کرے گا لیکن تصویر اس کے اندر مسرت کا جذبہ پیدا نہ کر سکے گی۔ ایک ماہر موسیقار کو ایک نئی دھن بنانے میں جتنی خوشی ہوتی ہے اتنی ہی خوشی ایک مالی کو اپنی لہلہاتی ہوئی فصل کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ کون شخص کس چیز سے خوش ہوتا ہے۔ اور کون سی چیز اس کے رنج والم کا باعث بنتی ہے۔ یہ اس کی اپنی طبیعت پر منحصر ہے۔ خوشی کا یہ احساس ہمارے اپنے اندر ہی ہوتا ہے کوئی دوسرا شخص ہمیں اس بات سے واقف نہیں کراتا۔ اس خیال کو آزاد نے خط نمبر 6 صفحہ نمبر 42 میں یوں بیان کیا ہے۔

"راحت والم کا احساس ہمیں باہر سے لاکر کوئی نہیں دے دیا کرتا۔ یہ ہمارا ہی احساس ہے جو کبھی زخم لگاتا ہے۔ کبھی مرہم بن جاتا ہے۔"

اس دنیا میں مطمئن زندگی گذارنے کے لیے انسان کے پاس کسی مقصد کیا مشغلے کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ ہر قسم کے آرام و آسائش کے میسّر ہونے کے باوجود بھی انسان کی زندگی میں اگر کوئی مشغلہ نہ ہو تو اس دُنیا میں زندگی بسر کرنا اس کے لیے دوبھر ہو جاتا ہے۔ اس بات کو فلسفیانہ انداز میں خط نمبر 6 اور صفحہ نمبر 43 میں مولانا آزاد نے یوں بیان کیا ہے۔

''زندگی بغیر کسی مقصد کے بسر نہیں کی جا سکتی۔ کوئی اٹکاؤ، کوئی بندھن ضرور ہونا چاہیے کہ جس کی خاطر زندگی کے دن کاٹے جا سکیں۔

یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ یکسانیت سے اُوب جاتی ہے۔ طفل ہو یا نوجوان، زن ہو یا مرد ایک ہی طرح کے صبح و شام سے اکتا جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کچھ تو ایسا ہنگامہ ہو جو روزمرہ کی زندگی سے مختلف ہو۔ تبدیلی انسانی میں ایک نیا جوش اور امنگ بھر دیتی ہے۔ اس سلسلے میں خط نمبر 6 صفحہ نمبر 44 میں مولانا آزاد کا خیال دیکھیے یکسانی اگرچہ سکون و راحت کی ہو یکسانی ہوئی اور یکسانی بجائے خود زندگی کی سب سے بڑے بے لطفی ہے۔ تبدیلی اگرچہ سکون سے اضطراب کی ہوگی پھر بھی تبدیلی ہے اور تبدیلی بجائے خود زندگی کی سب سے بڑی لذت ہے۔''

زندگی میں انسان کی حقیقی مسرت اس وقت حاصل ہوتی ہے۔ جب وہ سعی پیہم سے کسی چیز پر دسترس حاصل کرتا ہے۔ یہ قانون قدرت ہے کہ بغیر محنت کیے دنیا میں ہمیں کوئی چیز میسّر نہیں آتی۔ جب تک ہم کوئی چیز قربان نہیں کرتے اس وقت تک دوسری شۓ میسّر نہیں ہوتی۔ مثلاً دنیا میں کوئی بھی شخص عالم، مفکر، محدث اور موجد یوں ہی نہیں بنتا۔ ان اشخاص نے اپنی زندگی کی رنگین دلچسپیاں، خواہشات اور آرزوؤں کو دفن کر کے اپنا تمام وقت علم و فن پر عبور حاصل کرنے کے لیے وقف کر دیا۔ تب کہیں جا کر وہ اپنے علم و فن کے شاہکار تخلیق کر پائے۔ ان اشخاص نے اپنا وقت اور محنت وقف کر دی۔ اس لئے وہ علم و فن کی بلند چوٹی پر پہنچ پائے۔ یعنی ایک چیز انہوں نے قربان اور دوسری چیز نہیں حاصل ہوئی خط نمبر 6 صفحہ 45 پر آزاد کا فلسفیانہ خیال دیکھیے۔

''یہاں پانے کا مزہ ان ہی کو مل سکتا ہے۔ جو کھو تا جاتے ہیں جو شخص نے کچھ کھویا ہی نہیں انھیں کیا معلوم کہ پانے کے معنی کیا ہوتے ہیں۔''

ہماری زندگی حرکت و عمل سے تعبیر ہے۔ زندگی کے آخری لمحے تک ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا بے حد ضروری ہے۔ کیوں کہ جب ہم ترک عمل کرتے ہیں۔ تو ہمارے اعضاء زنگ آلود ہو جاتے ہیں تب دنیا کا کوئی تیل ان اعضاء کو پھر سے حرکت میں نہیں لاتا۔ انسان ہی پھر کیا منحصر ہے اگر ہم انسان کی بنائی اشیاء کا جائزہ لیں گے تو بھی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جب تک جو شۓ زیر استعمال رہتی ہے۔ وہ صحیح اور ثابت رہتی ہے لیکن جوں ہی اس کا استعمال ترک کیا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ روبہ زوال ہو جاتی ہے۔ گویا زندہ رہنے کے لیے انسان کا کسی نہ کسی کام میں مشغول رہنا بے حد ضروری ہے یعنی اس دُنیا میں حرکت زندگی ہے۔ اور سکون موت ہے۔ خط نمبر 6 صفحہ 45 پر آزاد کا فلسفیانہ خیال دیکھیے۔

> ''خود ہماری زندگی کی حقیقت بھی حرکت و اضطراب کے ایک تسلسل کے سوا اور کیا ہے۔ جس حالت کو سکون سے تعبیر کرتے ہیں اگر چاہیں تو اسی کو موت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ موج جب تک مضطرب ہے زندہ ہے، آسودہ ہوئی اور معدوم ہوئی۔''

خوشی و مسرت کا جذبہ انسان کے اپنے اندر موجود ہوتا ہے وہ جس چیز سے جس طرح متاثر ہوگا وہ چیز اُسے اسی طرح متاثر کرے گی۔ انسان اگر چاہے تو آرام و آسائش کی کمی کے باوجود بھی خوشی خوشی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ نہ چاہے تو دُنیا کی کوئی خوشی و راحت اسے مسرت نہیں عطا کر سکتی۔ یعنی عہدہ، موقع محل اور امارات و غربت سے خوشی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس موضوع پر مولانا آزاد نے مفکرانہ انداز میں خط نمبر 9 صفحہ نمبر 68 پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

> ''جنگل کے مور کو باغ و چمن کے جستجو نہیں ہوتی، اس کا چمن اس کے بغل میں موجود رہتا ہے۔ جہاں کہیں پر کھول دے گا ایک چمنستان بوقلموں کھل جائے گا۔''

خدا اور انسان میں یہ فرق ہے کہ خدا دُنیا کے تمام انسان کے ساتھ ہے اور اس کی وحدانیت یہ ہے کوئی اس کے حکم کو مانے یا نہ مانے کافر اور مسلمان دونوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتا ہے۔ لیکن انسان کو جب خدا بلند منصب و درجہ عطا کرتا ہے تو وہ شخص اپنی بشریت کو بھول جاتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ لوگ بغیر چوں چرا کیے اس کے احکام کی تعمیل کریں جو شخص اس کی بات سے انحراف کرتا ہے تو مقتدر شخص منحرف پر عرصہ حیات تنگ کر دیتا ہے۔ خدا کی فیاضی اور انسان کی تنگ دلی پر خط نمبر 9 صفحہ نمبر 71 پر آزاد کا یہ فلسفیانہ خیال دیکھیے۔

> ''فطرت نے انسان کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کو شاد کام رکھے، کسی کو محروم کر دے۔ وہ جب کبھی اپنے چہرے سے نقاب اٹھتی ہے، تو سب کو یکساں طور پر نظارہ حسن کی دعوت دیتی ہے یہ ہماری غفلت ہے کہ نظر اٹھا کر دیکھتے ہی نہیں اور صرف اپنے گردو پیش ہی میں کھوئے رہتے ہیں۔''

دُنیا میں خوش رہنے کے لیے پہلو میں ایک زندہ دل کا ہونا بے حد ضروری ہے اور یہی ہماری کامیابی کا ضامن ہے۔ دل اگر زندہ ہو تو ہم معمولی سی معمولی چیز سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں اور ہر چیز کے روشن پہلو کو دیکھتے ہیں۔ اگر دل ہی مردہ ہو گیا تو ہر شۓ میں ہمیں خامیاں ہی خامیاں نظر آئیں گی اور دنیا کی بڑے سے بڑی خوشی بھی ہمیں مسرور نہ کرے گی۔ اس لئے کوئی حالت ہو، کوئی مقام و موقع، دل کی تڑپ کو دھیمی نہیں ہونے دینا چاہیے کیوں کہ جہاں دل کی کلی مرجھا گئی تو سمجھو وہیں ہماری زندگی کی تمام رونقیں ختم ہو گئیں۔ اس خیال کو آزاد نے مفکرانہ انداز میں خط نمبر 9 صفحہ نمبر 70 پر یوں بیان کیا ہے۔

> ''ایوان و محل نہ ہوں تو کسی درخت کے سائے سے کام لیں۔ دیبا و مخمل کا فرش نہ ملے تو سبزہ خودرو کے فرش پر جا بیٹھیں۔ اگر برقی روشنی کے کنول میسر نہیں ہیں، تو آسمان کی قندیلوں کو کون بجھا سکتا ہے۔ اگر دنیا کی ساری مصنوعی خوشیاں اوجھل ہو گئیں تو ہو جائیں صبح اب بھی ہر روز مسکرائے گی۔ چاندنی اب بھی جلوہ فروشیاں کرے گی لیکن اگر زندہ دل نہ رہے تو خدارا بتلایئے اس کا بدل کہاں ڈھونڈیں۔''

بعض افراد کا یہ خواب ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کوئی شہرہ آفاق کارنامہ انجام دیں کارنامے کو انجام دینے کے لیے لوگ اپنی زندگیاں وقف کر دیتے ہیں۔ لیکن مولانا آزاد کا خیال ان افراد سے بالکل مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا کا سب سے کٹھن کام یہ ہے کہ انسان دنیا کی تکالیف کا مردانہ مقابلہ کر کے اپنی زندگی ہنسی خوشی بسر کرے، گویا صبر و استقلال کے ساتھ تکالیف کو برداشت کرنا ہی دراصل زندگی کا سب سے مشکل ترین کام ہے۔ ورنہ موت تو تمام پریشانیوں کا یک لخت خاتمہ کر دیتی ہے۔ اور انسان کو ایک پرسکون دنیا میں لے جاتی ہے۔ خط نمبر 9 صفحہ نمبر 73 پر آزاد کا خیال ملاحظہ ہو:

> ''لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں کے لیے کام میں لائیں۔ لیکن نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہے۔ یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا۔ یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی نہیں کہ مر جائے اور اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہ ہوا کہ زندہ رہے جس نے یہ مشکل حل کر لی گویا اس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دیا''

انسان کو سماجی جانور کہا جاتا ہے کیوں کہ بغیر معاشرے اور افراد کے وہ اپنی زندگی کی بنیادی ضرورتوں کو پرا نہیں کر سکتا۔ جس طرح ناخن انگلیوں سے وابستہ ہے۔ اسی طرح اس دُنیا میں ایک شخص دوسرے شخص سے وابستہ ہے۔ اس لئے جب ایک شخص کی زندگی میں کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو اس کا اثر اس سے متعلق تمام افراد پر ہوتا ہے۔ یہاں کوئی شخص اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میری زندگی ہے اس لیے میں اسے جس طرح چاہوں بسر کروں گا۔ اس دُنیا میں انسان اپنی ہر خوشی اور غم کے لیے دوسرے انسان پر مبنی ہے اس لیے دوسروں کو خوش رکھ کر ہی وہ خوش رہ سکتا ہے۔ کیوں کہ تنہا وہ کتنا بھی خوش ہوا گر اس کے اطراف اداس و غمگین چہرے ہوں گے تو اس کی خوشی اسے حقیقی مسرت عطا نہ کرے گی۔ خط نمبر 9 صفحہ نمبر 74 پر آزاد کا خیال ملاحظہ ہو:

> ''ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔ یہاں ہر چہرے کا عکس بیک وقت سینکڑوں آئینوں میں پڑنے لگتا ہے۔ اگر ایک چہرے پر غبار آجائے تو سینکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائیں گے۔ ہم میں سے ہر فرد کی زندگی محض ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے۔ وہ پورے مجموعے کا حادثہ ہے۔ ہم جو کچھ اپنے لیے کرتے ہیں اس میں بھی دوسروں کا حصہ ہوتا ہے۔ ہماری کوئی خوشی بھی ہمیں خوش نہ کر سکے گی اگر ہمارے چاروں طرف غمناک چہرے اکٹھے ہو جائیں گے''

جس دنیا میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں یہ دنیا خدا نے انسان اور صرف انسان کے لیے بنائی ہے۔ لہٰذا انسان کا یہ فرض بنتا ہے کہ احکام الٰہی کی تعمیل کے بعد ممنوع چیزوں سے پرہیز کر کے دنیا کی ہر نعمت، رونق اور خوبصورتی سے نقصان دوز ہوں۔ خدا نے انسان سے یہ نہیں کہا ہے کہ اپنے آپ کو دنیا کی نعمتوں سے محروم رکھ کر ایک مرجھایا ہوا، سوکھا چہرہ بنا کر شب و روز جنت کی نعمتوں کو حاصل کرنے کی خواہش میں صرف اور صرف عبادت میں مصروف رہے۔ احکام ظاہری کو ادا کرنے کے بعد خدا کی سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ انسان خدا کی بنائی ہوئی اس خوبصورت دنیا پر غور و فکر کرے اور اس کی کبریائی و بزرگی کو مانے اور ہر نعمت سے لطف اندوز ہو۔ ایسے ہی لوگ دنیا میں رہنے کے مستحق ہیں خط نمبر 9 صفحہ نمبر 76 میں اظہار خیال دیکھئے۔

> ''جس مرقع میں سورج کی چمکتی ہوئی پیشانی، چاند کا ہنستا ہوا چہرہ، ستاروں کی چمک، درختوں کا رقص، پرندوں کا نغمہ آب رواں کا ترنم اور پھولوں کی رنگین ادائیں اپنی اپنی جلوہ طرازیاں رکھتی ہوں۔ اس میں ہم ایک بجھے ہوئے دل اور سوکھے چہرے کے ساتھ جگہ پانے کے لیے یقیناً مستحق نہیں ہو سکتے فطرت کی اس بزم نشاط میں وہی زندگی سج سکتی ہے۔ جو ایک دمکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر رکھتی ہو۔''

اس دنیا میں ایسے انسان ہی کو کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ جو پیہم جدو جہد کرتا ہے اور ساتھ ہی خدا سے اپنی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہے۔ یہ قانون قدرت ہے کہ بغیر جدو جہد کئے وہ موہنا تواں کو بھی کامیابی نہیں دیتا۔ پھر انسان تو اشرف المخلوقات ہے۔ بھلا خدا اسے بغیر محنت وجدو جہد کے کس طرح کامیابی دے گا۔ انسان کی اپنی جنت اس کے خون جگر میں پنہاں ہے۔ اگر وہ کوشش کرے گا تو خدا بے شک اسے نوازے گا۔ اگر کوئی شخص کسی چیز کو حاصل کرنے کے لیے موزوں وقت پر کوشش نہیں کرے گا۔ اور شب وروز کو ظائف میں مصروف رہ کر خدا سے کامیابی کی توقع رکھے گا۔ تو ایسا شخص مذہبی ہونے کے باوجود بھی اسے کامیابی حاصل نہ ہوگی۔ خط نمبر 13 صفحہ نمبر 149 آزاد کا فلسفانہ خیال دیکھئے:

> ''دعائیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں مگر ان کو پہنچاتی ہیں جو عزم و ہمت رکھتے ہیں۔ بے ہمتوں کے لیے تو وہ ترک عمل اور تعطل قویٰ کا حیلہ بن جاتی ہیں۔''

اس دُنیا میں معمولی کام ہو یا کسی مہم کو سر کرنا، کامیابی اس شخص کو حاصل ہوتی ہے۔ جس میں جرات، ہمت اور حوصلہ ہو۔ جس نے جرات کی، اسے کامیابی نصیب ہوئی، جس کا حوصلہ پست ہو گیا وہ پیچھے رہ گیا۔ انسان ہو یا کوئی اور جاندار ہر ذی روح کو مناسب موقع پر ہمت دکھانے کی بے حد ضرورت ہے۔ جو ہمت کر کے پہلے قدم اٹھاتا ہے کامیابی اسی کے قدم چومتی ہے۔ اس سلسلے میں خط نمبر 19 صفحہ نمبر 217 پر آزاد کا خیال دیکھئے:

> ''اس بزم سود وزیاں میں کامرانی کا جام کبھی کوتاہ دستوں کے لیے نہیں بھرا گیا۔ وہ ہمیشہ ان کے حصے میں آیا جو خود بڑھ کر جام اٹھا لینے کی جرات رکھتے ہیں۔''

ہر ذی روح میں خدا نے کوئی نہ کوئی صلاحیت ودیعت کی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان یا حیوان اپنی صلاحیت کو پہچانے اور جب تک ان میں خود شناسی کا احساس جاگ نہیں جاتا وہ اپنی حقیقت سے بے خبر رہتے لیکن جوں ہی ان کی خود شناسی بیدار ہو جاتی ہے انہیں حقیقت کا عرفان ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب پرندے کی خود شناسی بیدار ہو جاتی ہے۔ کہ میں ایک اڑنے والا پرندہ ہوں اور مجھے اڑنا چاہیے تو وہ اڑنے کا قصد کرتا ہے اور جب انسان کی خود شناسی بیدار ہو جاتی ہے تو وہ زمین کے پستی سے نکل کر فلک کی طرف اڑان بھرنے کی سعی کرتا ہے۔ خط نمبر 20 صفحہ نمبر 233 آزاد کے خیال پر غور کیجیے۔

> ''انسان کی خود شناسی جب تک سوئی ہوئی رہتی ہے۔ باہر کا کوئی ہنگامہ اسے بیدار نہیں کر سکتا لیکن جوں ہی اسکے اندر کا عرفان جاگ اٹھا اور اسے معلوم ہو گیا کہ اس کی چھپی ہوئی حقیقت کیا ہے تو پھر چشم زدن میں سارا انقلاب حال انجام پا جاتا ہے۔ اور ایک ہی جست میں خاک سے اڑ کر رفعت افلاک تک پہنچ جاتا ہے۔''

ابتدائے آفرینش سے آج تک کی دُنیا کا اگر ہم جائزہ لیں گے تو یہ حقیقت ہم پر منکشف ہو جاتی ہے۔ کہ دُنیا میں اگر کسی چیز کو پائیداری ہے۔ تو وہ تغیر و انقلاب کو ہے۔ یہاں ہر پل کوئی نہ کوئی تبدیلی ہوتی ہی رہتی ہے۔ یعنی کوئی موت کا شکار ہوتا ہے۔ تو کسی کو زندگی عطا ہوتی ہے۔ کوئی نامراد ہو جاتا ہے تو کسی کو کامرانی عطا ہوتی ہے۔ گویا پل کے پل ہی میں زندگی کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ یعنی کبھی خوشگواریوں سے ہم کنار ہوتی ہے۔ تو کبھی رنج سے گلے ملتی ہے خط نمبر 20 صفحہ نمبر 232 آزاد کا فلسفیانہ خیال ملاحظہ فرمایئے:

"گویا بے طاقتی سے توانائی، غفلت سے بیداری بے پروائی سے بلند پروازی اور موت سے زندگی کا پورا انقلاب چشم زدن میں ہو گیا غور کیجیے تو یہی چشم زدن کا وقفہ زندگی کے پورے افسانہ کا خلاصہ ہے۔"

جب کسی درخت کی شاخ اس سے جدا ہو جاتی ہے تو پھر موسم بہار ہو یا خزاں، کوئی موسم اس بے جان شاخ پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ بالکل اسی طرح انسان کے دل کے درخت کا بھی حال ہے۔ اس درخت پر بھی مختلف آرزؤں اور خواہشوں کو ٹہنیاں لگی ہوتی ہیں۔ لیکن جب یہ خواہشات پوری نہیں ہوتیں تو وہ شاخیں مرجھا جاتی ہیں اور ایک مرتبہ جب یہ شاخیں مرجھا جاتی ہے۔ تو دُنیا کی بڑی سے بڑی خوشی بھی انہیں سر سبز و شاداب نہیں کرتی خط نمبر 22 صفحہ نمبر 244 آزاد کا مفکرانہ خیال کا عکس دیکھئے:

"انسان کی دل کی سرزمین کا بھی یہی حال ہے اس باغ میں بھی امید و بیم کے بے شمار درخت اگتے ہیں اور بہار کی آمد کی راہ تکتے رہتے ہیں لیکن جن ٹہنیوں کی جڑ کٹ گئی۔ ان پر بہار و خزاں کی تبدیلیاں کوئی اثر نہیں کرتیں۔ کوئی موسم بھی انہیں شادابی کا پیام نہیں پہنچا سکتا۔"

یہ فطرت و قدرت کا قانون ہے کہ انسان ہو یا دُنیا کی کوئی اور شے جو چیز دُنیا کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے اسے رکھا جاتا ہے جو بے مصرف ہو جاتی ہے۔ اسے ختم کیا جاتا ہے اس کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ خط نمبر 22 صفحہ نمبر 248 پر مولانا آزاد کا اظہار ملاحظہ ہو:

"سچی جگل کا جو درخت پھل اور پھول لاتا ہے۔ اس کی رکھوائی کی جاتی ہے۔ جو بیکار ہو جاتا ہے۔ اس چھانٹ دیا جاتا ہے۔"

مولانا آزاد عربی فلسفی ابو العلا المعری فارابی فلسفی البیرونی، رازی اور امام غزالی کی طرح اپنے عہد کے ایک منفرد فلسفی تھے۔ وہ چودھیویں صدی کی ہجری کی اردو انثر کے درخشندہ چند آفتاب و چند مہتاب تھے۔ "غبار خاطر" میں انہوں نے اپنی لاہوتی زبان سے مختلف موضوعات پر مضامین کا ایسا فسوں ساز سماں باندھا ہے کہ مطالعے کے دوران قاری خود کو بھول جاتا ہے۔ لیکن اس کو ہر یکتا کی وہ قدر و منزلت نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے اور اس بات کا گلہ خود آزاد کو بھی ہے۔ جس کا اظہار خود انہوں نے اس طرح کیا ہے۔

"میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ میں اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا۔ مگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔

غرض ''غبار خاطر'' کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد ویکتائے روزگار ادیب تھے۔ اور انہوں نے خطوط کی شکل میں اردو داں طبقے کے روبرو فکر وفلسفہ کا ایسا بے مثل سلسلہ چھوڑا ہے۔ جس میں زندگی کی گتھیاں سلجھتی ہیں۔ اور انسان کو دُنیا میں اپنے وجود کا مقصد سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ اس لیے ''غبار خاطر'' کو مولانا آزاد کے فکر وفلسفہ کی پرچھائیوں سے مالا مال ایک ایسی کتاب قرار دیا جائے گا۔ جس میں زندگی کی حقیقت کا انکشاف اور انسانی کے وجود کی نشاندہی ہوتی ہے۔ خدا اور بندے کے رشتے کے راز افشاں ہونے لگتے ہیں۔ اس طرح ''غبار خاطر'' اردو ادب کا ایک فن پارہ ہونے کے ساتھ ساتھ حیات ممات کی نمائندگی کرنے والی ایک بے مثل جس میں مولانا آزاد نے اپنے تجربات اور مشاہدات کا عطر کشیدہ کر کے رکھ دیا ہے۔ چنانچہ ادبی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ ذہنی الجھنوں کو دور کرنے کے معاملے میں بھی ''غبار خاطر'' کو ایک وسیلہ کتاب کا درجہ دیا جائے گا۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر فرزانہ ایم۔ شیخ (اسوسیٹ پروفیسر)
یو۔ ای۔ ایس مہیلا مہا ودھیالیہ، سولاپور۔

Dr. Farzana M. Shaikh
Associate Professor & H.O.D.URDU U.E.S. Mahila Maha Viddyalae Solapur. (MS)